رجسٹرڈ نمبر اے ۴۰

چندہ سالانہ ؎ صر

علی گڈھ

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا پندرہ روزہ اخبار

۱۶ دسمبر ۱۹۶۰ء | ایڈیٹر :- وارث کرمانی | جلد ۶ شمارہ نمبر ۵

حریفانِ بادہ پیما

(۱۵)

ڈاکٹر سید عابد حسین

خلیل الرحمٰن اعظمی

راہی معصوم رضا

شہریار

تاثرات

جشنِ افتتاح

۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو مسلم یونیورسٹی کی نئی تعمیر کردہ آزاد لائبریری کا افتتاح کرنے علی گڑھ تشریف لائے۔ تقریباً ۱۲½ بجے دن میں ان کا ہوائی جہاز خاص طور سے بنائے ہوئے ایرا سٹرپ پر اترا جہاں پرو چانسلر، وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، کلکٹر ضلع سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دوسرے سربرآوردہ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ہوائی اسٹیشن سے پنڈت نہرو سیدھے آزاد لائبریری کی عمارت پہنچے۔ جہاں این سی سی نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد موصوف عمائدین یونیورسٹی کے جلوس کے ساتھ جس میں یو۔ اے۔ آر اور ایران کے سفیر بھی شامل تھے پنڈال میں پہنچے۔ یہ پنڈال لائبریری کے قریب ہی نصب کیا گیا تھا جس میں طلبا، اساتذہ، اولڈ بوائز ممبران اکزکٹو کاونسل وغیرہ کے بلاک الگ الگ بنائے گئے تھے۔ پنڈال کی رنگین چھت سرخ پوش ستون اور دور تک پھیلی ہوئی دبیز قناتیں اپنی وسعت اور کشادگی کے لحاظ سے اس دل بادل خیمہ کی یاد دلاتی تھیں جسے صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ نے خاص طور سے تیار کرایا تھا۔ لیکن اپنے محبوب وزیر اعظم کو دیکھنے کے لئے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے ہجوم کی یہ کیفیت تھی کہ اتنا بڑا پنڈال بھی ناکافی ہو رہا تھا۔ وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی نے مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پانچ سال پہلے جس لائبریری کا سنگ بنیاد وزیر اعظم نے رکھا تھا آج اس کا افتتاح کرنے بھی وہی آئے ہیں۔ آج ہمارا بہت دیرینہ خواب پورا ہو رہا ہے۔ یہ لائبریری مولانا آزاد کے نام گرامی سے منسوب ہے۔ وہ نہ صرف علم سے محبت کرتے تھے بلکہ علم کو عمل کا جامہ پہنا کر اور اپنی شخصیت میں رچا بسا کر انھوں نے دوسروں کے لئے تقلید کی راہیں کھول دیں۔ زیدی صاحب نے مزید فرمایا "ہم یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ممنون ہیں جس نے اس لائبریری کی عمارت کے لئے چودہ لاکھ روپیہ کی گرانٹ منظور کی۔ اس لائبریری میں ایسے نادر نسخے اور مخطوطے وافر تعداد میں جمع کئے گئے ہیں جو ہندوستان کی دوسری لائبریریوں میں مشکل سے ملیں گے۔ امسال لائبریری میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ بہتر ہزار ہے۔ ہم پریسیڈنٹ جمال عبدالناصر، الحاج محمد عبید الرحمٰن خاں شروانی بیگم رام بالو سکسینہ اور اشفاق حسین صاحب کے شکرگذار ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں کے گرانقدر عطیات سے ہمیں نوازا ہے۔ وائس چانسلر کے بعد پنڈت نہرو نے اپنی تقریر سادہ اور بے تکلف انداز میں شروع کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ اسی طرح مزے مزے سے بولتے رہے۔ اس تقریر میں نہ آواز کی گھن گرج تھی اور نہ خطابت کے پیچ و خم بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گھر کا بزرگ اپنے بچوں سے مصروف گفتگو ہے۔

پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں طالب علموں کو ہر قسم کی تنگ نظری سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ شخصیت کی تعمیر ایسی ہونی چاہئے جس میں ماضی کی بہترین روایات کے ساتھ ساتھ مستقبل سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہو۔ ماضی اور مستقبل میں ایک خوشگوار توازن قائم کرنا اچھا اور کامیاب انسان بننے کے لئے از حد ضروری ہے آج کی زندگی متعدد سماجی، سیاسی اور معاشی پیچیدگیوں سے عبارت ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں پنڈت نہرو نے مولانا آزاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ماضی کے علم و تہذیب کے امین ہوتے ہوئے مستقبل کے معمار بھی ثابت ہوئے انھوں نے ہندوستان کی تاریخ پر بلاشبہ اپنا اثر ڈالا ہے۔

ڈائس کے بالکل نیچے بیٹھے ہوئے بچوں کو دیکھ کر پنڈت نہرو نے کہا کہ ان تمام بچوں کو دیکھ کر مجھے اب سے پندرہ بیس سال بعد کی دنیا کا خیال آتا ہے جس کا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہوگا حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ بیس سال بعد آنے والی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ دنیا یقیناً آج جیسی نہ ہوگی۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ یہ بچے اس دنیا سے لطف اندوز ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی افسوس بھی ہوتا ہے کہ اُس وقت ہم نہ ہوں گے۔ خیر اتنی عمر میں ہم نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں، بہرحال آدمی کو مزید دیکھنے کی ہوس ضرور رہتی ہے"۔

تقریر ختم کرکے وزیر اعظم نے ایک الکٹرک بٹن دبا کر رسم افتتاح ادا کی۔ آخر میں پرو چانسلر نواب صاحب چھتاری نے پنڈت نہرو کا شکریہ ادا کیا۔ رسم افتتاح کے بعد پنڈت نہرو نے آزاد لائبریری میں حبیب الرحمٰن خاں شروانی کلکشن کا بھی افتتاح کیا۔ یہ سیکشن نواب صدر یار جنگ محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم کے کتب خانے سے قائم ہوا ہے جسے ان کے دریادل فرزند حاجی محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی آنریری ٹریژرار نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی نذر کر دیا ہے۔ اس کے بعد پنڈت نہرو لنچ کے لئے اپنے قدیم دوست جناب عبدالمجید خواجہ کے یہاں گئے۔ لنچ کے بعد موصوف نے ٹیکارام کالج میں کملا نہرو ہوسٹل کا افتتاح کیا دوسرے وقت یونین کے بالاخانے سے پارک میں کھڑے ہوئے طلبہ کے کثیر مجمع کو انگریزی میں خطاب کیا پھر اسٹاف کلب میں منعقدہ ایٹ ہوم میں شریک ہو کر دہلی روانہ ہو گئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تاریخ میں یہ دن ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو لائبریریوں، اسکولوں اور دوسرے اداروں کے افتتاح آئے دن ہمارے ملک میں ہوا کرتے ہیں۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کی عظیم الشان آزاد لائبریری کا وزیر اعظم کے ہاتھوں افتتاح محض افتتاح نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کی صدہا سال کی مشترک تہذیب پر مہر توثیق ہے اور مستقبل کے ہندوستان میں اس تہذیب کے باقی رہنے اور پروان چڑھنے کی ضمانت ہے۔ یہ تہذیب ایک مدت دراز سے ہمارے لئے سرمایۂ جان و دل رہی ہے اس کی تعمیر میں ہندوستان کے فقیروں اور بادشاہوں نے یکساں طور سے اپنی زندگیاں وقف کی تھیں۔ اس تہذیب کو خوبصورت بنانے اور عام کرنے میں امیر خسرو، کبیر، نانک، تلسی داس اور غالب نے اپنا خون جگر صرف کیا تھا۔ اس تہذیب نے جبکہ تمام یورپ مذہبی و قومی خونریزیوں کا شکار تھا اس ملک میں اکبر اعظم کے ہاتھوں محبت امن اور خوشی کا چراغ روشن کیا۔ اس تہذیب کے اولوالعزم فنکاروں نے اونگھتے ہوئے بوسیدہ شہروں کو یاقوت و مرمر کا نگار خانہ کر دیا۔ مولانا آزاد اسی تہذیب کے عاشق تھے پنڈت نہرو اسی تہذیب کا شاہکار ہیں۔ ان کی دلکش و جاذب شخصیت ان کا لباس اور لب و لہجہ یہاں تک کہ ان کے طرز فکر میں اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سب سے اہم رول اسی مشترک تہذیب کی نشو و نما کرنا ہے۔

پروفیسر موسوی کا خیر مقدم

۱۳ دسمبر ۶۰ء بوقت ۴ بجے شام پروفیسر موسوی (لکھنؤ یونیورسٹی) کے اعزاز میں شعبۂ فارسی کی لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک عصرانہ دیا گیا جس میں شعبۂ فارسی کے اساتذہ اور طلباء کے علاوہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، سید امین اشرف اور شہریار (ایڈیٹر علی گڑھ میگزین) بھی شریک تھے۔ اس مختصر لیکن پُر لطف محفل میں چائے کی پیالیوں کے ساتھ ساتھ ہی شعر و شاعری کا دور بھی رہا۔ سب سے پہلے آزاد عباسی (نائب صدر پرشین لٹریری سوسائٹی) اور وحید اشرف (معتمد اعزازی پرشین لٹریری سوسائٹی) نے سامعین کو اپنی غزلوں سے محظوظ کیا۔ اس کے علاوہ وارث کرمانی، امین اشرف اور شہریار نے غزلیں اور نظمیں سنائیں سب شعراء کی تخلیقات کو بہ ہمہ ذوق و شوق سنا گیا اور پسند کیا گیا۔

یونیورسٹی کی خبریں

ایرانی ادیب کا ورود

ایران کے ادیب جناب محمود صاحب تفضلی ۱۰ دسمبر ۶۰ء کی شب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لائے۔ یہاں شعبہ فارسی میں آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۲ دسمبر کی شام کو آپ کے اعزاز میں ایک عصرانہ بھی دیا گیا جس میں بہت سے استادوں نے شرکت کی آسمان منزل میں ایک تقریب ہوئی جس میں پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی نے آپ کا تعارف کرایا۔ تفضلی صاحب اپنے ہمراہ قدیم و جدید ایران سے متعلق بہت سی تصویریں لائے تھے جنھیں آپ نے اسکرین پر دکھلایا۔

انڈین ہسٹری کانگریس

انڈین ہسٹری کانگریس کا تیئسواں سیشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۲۶ دسمبر سے ۲۸ دسمبر تک منعقد ہوگا جس ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نمائندوں کے علاوہ باہر سے بھی بہت سے فاضل شرکت کریں گے۔ اس موقع پر ایک تاریخی نمائش بھی منعقد کی جائے گی۔

انجینیرنگ کالج کی نمایش

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج میں اس سال بھی حسب سابق ایک نمایش آخر نومبر میں منعقد کی گئی جس میں ٹکنولوجی کی بہت سی چیزوں کو پیش کرنے کے علاوہ مشاعرہ اور دوسرے پروگرام بھی ہوئے۔

یونیورسٹی اسپورٹ کا مختصر جائزہ

یونیورسٹی اتھلٹک کلب کے کپتان مقصود احمد صدیقی نے دہلی یونیورسٹی کے مقابلہ میں ہائی جمپ کا ایک نیا ریکارڈ قایم کیا۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستان کی کرکٹ ٹیم تیار کی جا رہی ہے۔ اس ٹیم میں کھیلنے والوں کے انتخاب کے لئے جو آزمایشی کھیل ہو رہے ہیں ان میں شرکت کے لئے یونیورسٹی کرکٹ کلب کے چار ممبروں کو مدعو کیا گیا ہے۔

یو۔پی باکسنگ ٹیم کے لئے یونیورسٹی باکسنگ کلب کے چار ممبروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ انٹر یونیورسٹی مقابلہ میں ہمارے طالب علم غضنفر علی باقری نے میرٹھ یونیورسٹی کا خطاب حاصل کیا۔ ہمارے سوئمنگ کلب کے ایک ممبر احمد نورالدین نے میرٹھ میں یو۔پی چمپین شپ حاصل کی۔

کالج ڈے

ویمنس کالج میں نومبر کے مہینہ میں کافی سرگرمیاں رہیں۔ اس سلسلہ میں ایک ڈبیٹ منعقد کی گئی جس میں کالج کی طالبات کے علاوہ ٹیکارام گرلس کالج اور اسٹوڈنٹس یونین کے نمائندوں نے بھی حصہ لیا۔ مسز سکینہ، مسز حبیب اور مونس رضا صاحب نے ججوں کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ ایک کلچرل پروگرام بھی ہوا جو صرف خواتین کے لئے تھا اس میں 'سیزر اور کلیوپٹرا' اور ایک اردو ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔

انڈو عرب ویک

۵ دسمبر سے ۹ دسمبر تک یونیورسٹی میں انڈو عرب ویک کافی گرمجوشی سے منایا گیا۔ ۴ بجے شام کو یونین ہال میں ہز اکسیلنسی سفیر یو۔اے۔آر نے اس کا افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد آزاد لائبریری میں صدر جمال عبدالناصر کی بھیجی ہوئی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ رات کو میرس ہال میں ایک ڈرامہ بھی ہوا اس کے علاوہ آسمان منزل میں ڈاکٹر احسان رشید پروفیسر ڈاکٹر عبدالمؤمن خاں اور ڈاکٹر مقبول احمد کے لکچر ہوئے۔ ۷ دسمبر کو ۴ بجے شام کے وقت ایک سمپوزیم منعقد ہوا جس میں سردار کے ایم پانیکر نے شرکت کی۔

پرووسٹ کا تقرر

معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور کو آفتاب ہال اور جناب ابو سالم کو وقار الملک ہال کا پرووسٹ مقرر کیا گیا ہے۔

اگزکٹو کاونسل کے دو نئے ممبر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اگزکٹو کاونسل کے لئے دو نئے ممبروں کو نامزد کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ممبر صادق علی صاحب ہیں جنھیں یونیورسٹی کے وزیٹر (صدر جمہوریہ) نے نامزد کیا ہے دوسرے ممبر شری جگن پرشاد راوت یو۔پی کے سابق نائب وزیر ہیں جنھیں گورنر اتر پردیش نے نامزد کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

عہدِ وسطیٰ کی مسلم تہذیب

اسلام کی ایک بڑی خصوصیت علم دوستی تھی قرآن میں کائنات کے مطالعہ اور تاریخ کے مطالعہ پر بہت زور دیا گیا ہے مگر فلسفہ کے میدان میں خیال آرائی کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کی گئی۔ اس لئے اسلام نے جو ذہنی بیداری اور حرکت عربوں اور دوسری قوموں میں پیدا کی وہ زیادہ تر تاریخ، جغرافیہ اور نیچرل سائنس (علوم طبعی) کے میدان میں ظاہر ہوئی۔

سب سے پہلے زندگی کی ضرورتوں سے علم دین نے نشو ونما پائی بنوامیہ کے زمانے میں دوسری تہذیبوں سے سابقہ سے عقیدے اور عمل کے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے اور علم عقائد اور علم فرائض کی باضابطہ تدوین کی طرف توجہ کی گئی۔ رومیوں کے بعد عرب ہی تھے جنھوں نے اصول قانون کو مرتب کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں اصولِ قانون کا ماخذ قرآن اور حدیث تھی۔ مگر انھوں نے اس کی تدوین میں رومی قانون کو بھی جو شام اور اس سے متصل علاقوں کے اسلامی ریاست میں شامل ہونے سے پہلے ان میں رائج تھا مدِ نظر رکھا۔

اس سلسلے میں زبان کے مسائل پیدا ہوئے غیر ملک کے مسلمان مذہبی تعلیم کے لئے عربی سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ عربی لغت اور صرف ونحو کے اصول مرتب کئے گئے۔ چونکہ عربی کئی صدی تک دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کی زبان رہی اس لئے عربی لسانیات کی نشو ونما دنیا کی علمی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک شعر وادب کا تعلق ہے اسلام نے عربوں کے قدرتی ذوق کی تکمیل کرکے ایک پاکیزہ اور جاندار شاعری پیدا کی۔ لیکن عباسیوں کے زمانے میں اس پر شاہی دربار کا رنگ چڑھنے لگا اور ایرانی اثرات غالب آنے لگے۔ اب اس میں وہ ابتدائی سادگی اصلیت اور جوش نہیں رہا بلکہ خیال آفرینی اور رنگین بیانی رہ گئی۔

اسلامی ذہن کا اصلی کارنامہ سماجی علوم اور سائنس میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے تاریخ اور عالم فطرت کے مطالعہ کی جو تاکید کی تھی اس سے مسلمانوں میں مذہبی بصیرت کے علاوہ ایک حد تک سائنٹیفک روح پیدا ہو گئی تھی جو زندگی اور کائنات کے بارے میں قیاس آرائی کرنے کے بجائے صبر اور دیدہ ریزی سے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر صحیح علم کی ٹھوس عمارت تعمیر کرتی ہے۔

تاریخ نگاری کی ابتدا، ابن اسحاق کی سیرت رسولؐ سے ہوئی جس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس انتہائی مذہبی عقیدت کے باوجود جو لف آں حضرتؐ سے رکھتا تھا اس نے واقعات کے بیان میں ذرا بھی مبالغہ یا رنگ آمیزی سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ وہ اب تک سیرت کی سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ بلاذری کے زمانے تک تاریخ ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر چکی تھی جس میں آثار قدیمہ، طبعی اور انسانی جغرافیہ اور علم الاقوام شامل تھے۔ اس کے بعد مسعودی اور البیرونی نے تاریخ نگاری کے علمی معیار کو اور بلند کر دیا۔ ابن خلدون نے جو چودھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے اپنے مشہور ومعروف مقدمۂ تاریخ کے ذریعے سے ایک نئے علم یعنی فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ جغرافیہ اور سفرنامہ عربوں کا خاص میدان ہے۔ انھوں نے بحری قطب نما ایجاد کرکے جہاز رانی کو بہت ترقی دی اور پرانی دنیا کا کونہ کونہ چھان کر زمین اور اس کے باشندوں کے متعلق اتنی معلومات جمع کر دی جو اس سے پہلے کبھی جمع نہیں ہوئی تھی جس زمانے میں دنیا عام طور پر زمین کے چپٹے ہونے کی قائل تھی۔ مسلمانوں کے مدرسوں میں جغرافیہ گلوب کی مدد سے پڑھایا جاتا تھا۔

علوم ریاضی الجبرا (جبر ومقابلہ) عربوں ہی کی ایجاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کچھ ابتدائی تصورات یونانیوں کو بھی تھے لیکن اسے باضابطہ علم کی حیثیت مسلمان ریاضی دانوں نے دی۔
علم ہیئت (اسٹرونومی) کی طرف ساتویں صدی عیسوی سے توجہ شروع کر دی گئی تھی۔

خلیفہ مامون نے بغداد میں اور دمشق کے پاس رصدگاہیں بنوائیں۔ اسی کے زمانے میں ایک نہایت مشکل اور باریک عمل کیا گیا جو ہیئت کی تاریخ میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ عرب ہیئت دانوں نے جن میں کہا جاتا ہے کہ مشہور ومعروف الخوارزمی بھی شامل تھا زمین کو گول مان کر دمشق کے شمال میں طول البلد کے ایک درجہ کی پیمایش کی تاکہ زمین کا سائز اور گھیر معلوم کریں۔ پیمائش ۵۶½ عربی میل نکلی اس میں اور آجکل کی پیمایش میں

صرف ۲۰،۰۰۰ فٹ کا یعنی ایک فیصدی سے بھی کم کا فرق ہے خلافتِ بغداد کے علاوہ مصر اور اسپین میں بھی ہیئت کی تحقیقات ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ البیرونی، عمر خیام اور الغ بیگ نے پندرہویں صدی کے وسط میں اس علم کو اس نقطہ پر پہنچا دیا جہاں سے یورپ کے جدید علم ہیئت تک کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

علوم طبیعی میں مسلمانوں کی اصل خدمت یہ ہے کہ انھوں نے تجربی طریق کو اتنے بڑے پیمانے پر برتا جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ فزکس کی مختلف شاخوں میں خصوصاً بصریات (اوپٹکس) میں ان کا حصہ بہت قابل قدر ہے۔ ابن الہیثم (۹۶۵ - ۱۰۳۵ عیسوی) جسے اہل یورپ الہزن کہتے ہیں عہد وسطیٰ کا سب سے بڑا ماہر طبیعات تھا۔

علم کیمیا کا مقصد اس زمانے میں کیمیا سازی یعنی معمولی دھاتوں سے سونا چاندی بنانا سمجھا جاتا تھا۔ اس فن کو عربوں نے اسکندریہ کے یونانیوں سے لیا تھا مگر جابر ابن حیان نے جو یورپ میں جیبر کے نام سے مشہور تھا آٹھویں صدی عیسوی میں جہاں کیمیا سازی پر کتابیں لکھیں وہاں چند ایسے رسالے بھی لکھے جن سے علمی تحقیق کی راہ کھل گئی اور موجودہ سائنٹفک کیمسٹری کی بنیاد پڑی۔

لیکن سب سے شاندار کام مسلمانوں نے طب جراحت اور متعلقہ علوم میں کیا۔ انھوں نے فن کو ابتدائی حالت میں یونانیوں سے لے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ دواؤں کی علمی تحقیق، فن دواسازی کی باقاعدہ تشکیل اور شفاخانوں کے قائم کرنے میں انھیں اوّلیت حاصل ہے۔ اسلامی ریاستوں کے ہر شہر میں دار الشفا ہوتے تھے جن میں مریضوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ خصوصاً قاہرہ اور قرطبہ میں تو شفاخانوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ ابو قاسم ابن عباس (وفات ۱۰۱۳ء) بہت بڑا سرجن گذرا ہے۔ جو عام آپریشنوں کے علاوہ عورتوں کے پیچیدہ امراض کے علاج بھی آپریشن سے کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پتھری کے آپریشن وہ جس صفائی سے کرتا تھا موجودہ زمانے میں اس سے کچھ زیادہ ترقی نہیں ہو سکی ہے۔ جہاں تک طبی نظریہ کا تعلق ہے رازی، ابن سینا، ابن رشد اور دوسرے مسلمان مصنفوں کی کتابیں سولہویں صدی تک ایشیا کے علاوہ یورپ میں بھی سب سے مستند سمجھی جاتی تھیں۔

فلسفہ کا ذوق مسلمان اہل فکر میں یونانی خیالات کے سابقہ سے پیدا ہوا اور اس کی نشو و نما آخر تک ہیلینی تہذیب کے مختلف مذاہب فلسفہ سے متاثر رہی۔ ابتدا میں نو فیثا غورثیوں کے نیم باطنی تصورات ان کے ذہن پر حاوی تھے۔ لیکن یہ دور جلدی گذر گیا اور پھر نو فلاطونیوں کی عقلی باطنیت اور ارسطو کی منظم منطقی فکر صدیوں تک ان میں مقبول رہی۔ ابن رشد سے پہلے مسلمان فلسفی ارسطو کی تعبیر نو فلاطونی یا اشراقی رنگ میں کرتے تھے۔

ابن رشد نے جسے اویروس کے نام سے یورپ کے عہد وسطیٰ کی علمی تاریخ میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، ارسطو کے خیالات کی نئی تفسیر کی، جس نے عربوں سے کہیں زیادہ اہل یورپ پر گہرا اثر ڈالا۔ سیاسی زوال اور انتشار کے زمانے میں جو گیارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا مسلمانوں کی علمی فکر میں بھی زوال کے آثار نظر آنے لگے۔ بغداد کی مرکزیت ختم ہو گئی اور اسلامی تہذیب کی پہلی سی بین الاقوامی حیثیت نہیں رہی۔ مسلمان ملکوں کا شیرازہ بکھر گیا اور ان کی تہذیبوں میں ایک بڑے مشترک اسلامی عنصر کے ہوتے ہوئے بھی الگ الگ مقامی رنگ پیدا ہونے لگے۔

فنون لطیفہ میں ان قیود کی وجہ سے جو اسلام نے اجتماعی مصلحتوں سے عائد کی تھیں مصوری بین الاقوامی اسلامی تہذیب میں زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ ایک حد تک اس کی جگہ خوشنویسی نے لے لی اور اس نے یہ ترقی کی کہ فنون لطیفہ میں شمار ہونے لگی۔ موسیقی مذہبی قیود کے باوجود بہت پھولی پھلی خلفائے بنو امیہ کو بھی موسیقی سے تھوڑا بہت شوق تھا مگر بنو عباس کے زمانے میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ دوسری اسلامی ریاستوں خصوصاً اسپین نے بھی اس کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ خیال ہے یورپ میں جو ساز پہلے پہل استعمال ہوئے وہ اسپین کے عربوں سے لئے گئے تھے۔ عربوں کو اس زمانے میں اہل یورپ مور کہتے تھے۔ ان کی نسبت سے نہ صرف اسپین ہی میں بلکہ یورپ کی کل زبانوں میں یہ باجے مورلیسک کہلائے۔ فن کے علاوہ علم کی حیثیت سے بھی مسلمانوں نے موسیقی کی بڑی خدمت کی۔ فارابی ابو الفرج اور دوسرے فضلا کی موسیقی پر مستقل تصانیف موجود ہیں نغمہ کو ہندسوں اور خطوط کی شکل میں لکھنا بھی عربوں ہی کی ایجاد ہے۔

باقی

مراسلات

اُردو۔ علمی مباحثوں کا شکار

محترم تسلیم

اُردو کے مسئلے پر برسوں سے بحث ہورہی ہے اور غالباً ہوتی رہے گی۔ لیکن اگر آپ اس کے نتائج پر غور کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ اردو کا معاملہ اردو والوں کے درمیان علمی طور پر تو خوب چل رہا ہے لیکن عملی طور پر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ میں جب یہ بات کہہ رہا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ جس طرح اس کی مثالیں میرے سامنے ہیں۔ اسی طرح آپ کے پڑھنے والوں کی نظر میں بھی ہوں گی۔ پنڈت نہرو ذاتی طور پر اردو کے حق میں بیان دے سکتے ہیں۔ وزارت تعلیمات اردو شاعروں اور ادیبوں کو وظیفے اور انعامات دے دیتی ہے لیکن اس سے اردو کا مستقبل کس طرح روشن ہوتا ہے یہ بات میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ آج یہ عالم ہے کہ اترپردیش کے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اُردو کہیں نظر نہیں آتی۔ جن گھرانوں میں اُردو مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہے، اب وہاں اُردو کے خطوط پڑھنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ آزادی سے پہلے جس طرح فارسی اور عربی پڑھائی جاتی تھی اس طرح بھی آج اردو کے پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جہاں تک کالجوں کا تعلق ہے جن کالجوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

حکومت نے اُردو کو ہندوستان کی ایک زندہ زبان کی حیثیت سے تو تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ان زبانوں کی بھی زیادہ اہمیت ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد کے بارے میں حکومت کو بھی کوئی علم نہیں ہے۔

آسام کے ہنگاموں کے بعد حکومت لسانی مسئلے پر سنجیدگی سے غور کررہی ہے اور ہر زبان کے حقوق کو آئینی شکل دینے کی تدبیریں ہورہی ہیں لیکن اردو کا ذکر کہیں بھی نہیں آتا۔ پنجاب میں اردو کے مستقبل پر سرکاری طور پر مہر ثبت کردی گئی ہے۔ دلی میں جو کچھ پس پردہ ہورہا ہے اس کا علم کسے نہیں۔ ہندوستان کی تقریباً ہر یونیورسٹی ہندی یونیورسٹی ہونے والی ہے۔ دوسری اقلیتوں کی زبانیں بھی اپنی اپنی یونیورسٹی کے مطالبات پیش کررہی ہیں۔ ابھی چند روز قبل وزیر اعظم نے پنجابی یونیورسٹی کے بارے میں بھی ایک اہم اعلان فرمایا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُردو یونیورسٹی کا تصور بھی کسی سرکاری فائل میں ملتا ہے یا نہیں کیونکہ ابھی تو شاید یہ تصور ہمارے اپنے ذہنوں میں بھی نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اردو کا مسئلہ الکشن لڑنے والوں کی توجہ کا مرکز بھی بن جاتا تھا۔ لیکن غالباً اب تو سیاسی جماعتیں بھی اس کو اہمیت نہیں دیتیں۔ ہرچند وقت گذر چکا ہے لیکن تیرہ برس کی مدت قوموں کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس مسئلہ کو اگر علمی سطح سے بلند کرکے عملی طور پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اب اردو کا مسئلہ مباحثے کا موضوع نہیں رہا اس پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام کسی ایک ادارے کا نہیں بلکہ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کا اپنا کام ہے۔ اس لحاظ سے جلد ہی اس کا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہئے۔

جہاں سیاہ گھٹاؤں کے دام ڈالے ہیں
وہیں نمائش برق و شرر بھی ہوتی ہے

احمد سرور

(ادارہ)

علی گڑھ۔ مادر علمی کا نمائندہ اخبار

برادر عزیز وارث کرمانی صاحب۔ السلام علیکم

"علی گڑھ اخبار" کے جدید انتظام کی اطلاع پائی۔ میں نے "مادر علمی" کی محبت اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پائی ہے۔ اور اپنی تعلیمی زندگی کا زیادہ حصہ علی گڑھ ہی میں بسر کیا ہے تو اب بھی اس دیرینہ تعلق کا اثر باقی ہے۔ میں ہر اس تحریک کی قدر کرتا ہوں جس سے مسلم یونیورسٹی کو فائدہ حاصل ہو اور اولڈ بوائز

مستفید ہوں۔

آپ کے اخبار کو بہتر بنانے کے لئے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اچھے اشتہار حاصل کئے جائیں اور یونیورسٹی سے قریبی تعلق کے سبب سے اس اخبار کو جو موقر حیثیت حاصل ہے اس کے لحاظ سے تعلیمی سامان اور دوسری ضروری اشیا کے اشتہاروں کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

اس اخبار میں صرف وہی خبریں یا مضمون دئے جائیں جو یونیورسٹی اور اس کے موجودہ یا سابقہ طلبا سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور اس ادارہ کے مفاد کا باعث ہوں۔ گویا اس طور پر یہ اخبار اپنی یونیورسٹی کا غیر سرکاری نمائندہ ہو کر طلبا کی برادری میں مقبولیت اور عزت کا مقام حاصل کر سکتا ہے اور اس کی رائے موقر اور موثر ہوگی۔

محمد حضور عالم

داد یا بیداد

محترمی ایڈیٹر صاحب تسلیم

۱۶ نومبر سنہ ۱۹۷۰ء کے "علی گڑھ" میں نظر برنی صاحب کا مراسلہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی موصوف لکھتے ہیں:

"خلیل الرحمن اعظمی کی غزل بہت اچھی ہے۔ خاص طور سے مقطع بڑا ترش ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اعظمی صاحب کی غزل گویا عام طور پر ترش ہے۔ لیکن خاص طور سے مقطع بڑا ترش ہے"۔ اسی لئے "غزل بہت اچھی ہے" Appreciation کے اس نرالے انداز کو میں داد سمجھوں یا بیداد؟

نیاز مند
زاہد حسین
۳۸۔ ماریسن کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یاد ایاّم

(محمد حضور عالم)

۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں "خفائی" صاحب نے جن عباسی صاحب کا حال بیان کیا ہے وہ میرے بھی ہمعصر تھے اور میں نے "یاد احباب" میں شاید ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان سے میرا کچھ زیادہ ربط تو نہیں تھا۔ لیکن ان کی بعض خصوصیتیں ایسی تھیں جو ہر شخص کو نظر آتی تھیں۔ یونین کلب میں ان کی تقریریں بہت دلچسپ اور ہنگامہ خیز ہوتی تھیں۔ مخالفت کی پرواہ کئے ہوئے بغیر وہ نہایت دلیری کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ خدا کرے کہ عباس صاحب اب بھی ویسی ہی ہمت اور جوش کے ساتھ زندگی کی جدو جہد میں مصروف ہوں اور ان کے ذریعہ سے "مادر علمی" کا نام روشن ہو رہا ہو۔

"خفائی" صاحب اگر پردہ سے باہر آجائیں تو ان کے جاننے والے اس "رونمائی" سے خوش ہوں گے۔ میرا گمان ہے کہ میں بھی ان سے واقف ہوں۔ مگر ان کی مرضی کے خلاف ان کو "بے پردہ" کرنا مناسب نہیں ہے اور نہ ذوق سلیم ہی اسکی اجازت دیتا ہے۔

"خفائی" صاحب نے "جیلانی" کو بھی یاد کیا ہے اور انکی مراد شاید "امیر احمد جیلانی" (مرحوم) سے ہے۔ جن سے میں سنہ ۱۹۱۲ء سے واقف تھا۔ جب وہ آگرہ کالج کے ہوسٹل (Tyler House) میں میرے ایک ہموطن (فضل علی) کے ساتھ رہتے تھے۔ وہاں سے "ایف۔ اے" کے امتحان میں فیل ہو کر شاید سنہ ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ پہونچے تھے اور اس وقت تک یونیورسٹی میں تعلیم پاتے رہے۔ جب ان کا لڑکا بھی اسکول میں داخل ہو گیا۔ "بی اے" کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کی اور علی گڑھ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جہاں شاید وہ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ میری آخری ملاقات غالباً سنہ ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی جب میں آخری دفعہ علی گڑھ جا کر ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں شریک ہوا تھا۔ جیلانی مرحوم سے کچھ لوگ اس سبب سے ناراض تھے کہ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک ایسی "نائٹل لسٹ" چھاپی گئی تھی جس میں بے بنیاد اتہام اور گندے الفاظ تھے اور اس میں زیادہ تر ایسے نام تھے جن سے جیلانی کی مخالفت تھی تو ان ہی پر شبہ ہوا اور اس کے بدلے میں ان کے ساتھ برا سلوک بھی کیا گیا۔ مگر جیلانی (مرحوم) کو قصور وار ماننے والے بھی جانتے تھے کہ وہ ایک زندہ دل اور خوش باش شخص تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ایک ہی طریقہ پر بسر کی اور ہنستا ہنساتا ہوا اس جہان سے گذر گیا۔ بقول حضرت غالب

وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہے

اللہ تعالیٰ مرحوم کے گناہوں کو معاف فرمائے اور انکی روح کو ابدی راحت حاصل ہو۔

"خفائی" نے مولانا الیاس کا نام بھی لکھا ہے۔ میرے ہمعصروں میں ایک صاحب الیاس حسین نامی تھے جو کرت پور (ضلع بجنور) کے ساکن تھے۔ پہلے تو وہ بھی بارک (سید محمود ... [illegible] ... عزیز الرحمن وغیرہ کے ساتھ (باقی صفحہ ۹ کالم ۱ پر دیکھئے)

خلیل الرحمٰن اعظمی

تذکرہ شعرائے علی گڑھ

سبب تالیف

اردو زبان میں جس چیز کو "تنقیدی مضمون" کہا جاتا ہے اس کی ایک پہچان یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ عموماً کسی مغربی مفکر کے قول سے شروع ہوتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے، ملٹن کہتا ہے، مل کہتا ہے، شوپنہار کا قول ہے، برگساں کا کہنا ہے، ٹی ایس ایلیٹ کا مقولہ ہے، بلنسکی لکھتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اگر یہ نہیں تو "ایک مغربی مفکر کا قول ہے" سے مضمون کا آغاز ہوتا ہے۔ خاکسار ذرہ بے مقدار یعنی شعرائے علی گڑھ کے اس ہیچداں تذکرہ نگار کو اپنے بارے میں ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ وہ جو کچھ اناپ شناپ لکھتا رہا ہے اسے تنقید کے زمرے میں لایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں اس لئے اس قسم کے عالمانہ پیرایۂ بیان کو اختیار کرنے کا اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس تذکرے کا سبب تالیف ہی ایک مغربی مفکر کا قول ہے حالانکہ اس تذکرے کا تنقید سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں جس قول زریں سے متاثر ہو کر اس ناچیز نے اپنے زمانے کے چند شعرا اور وہ بھی ایک ہی بستی کے بسنے والوں کے بارے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ خامہ فرسائی کی جرأت کی ہے وہ ایمرسن کا ایک فقرہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "جب میں کسی نئی کتاب کو بازار میں مقبول ہوتے دیکھتا ہوں تو کوئی بہت پرانی کتاب پڑھنے کے لئے اٹھا لیتا ہوں" اس فقرے سے فائدہ اٹھا کر ہمارے آج کل کے نقادوں نے اپنے ہمعصروں کے بارے میں سرسری مضمون نگاری اور تبصرہ نویسی سے بھی ہاتھ اٹھا لیا ہے اور اچھے بھلے جدید رجحانات کے ناقد اب "کلیات میر" اور "باغ و بہار" وغیرہ کی اڈیٹنگ میں مصروف ہیں۔ خیر یہاں تک بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن ادھر یہ شوق پیدا ہوا ہے کہ اردو کا ہر وہ لکھنے والا جو شاعری، ناول، افسانہ یا ڈرامہ وغیرہ تخلیق کرنے کا اہل نہ ہو یعنی کسی اور طرح کی مخلوق ہو اسے "اسکالر" یا "محقق" ہونا چاہئے اور اس کے لئے یہ ضروری قرار پایا کہ وہ کونے کھدرے کے غریب اور بیچارے شاعروں کو مٹی کے نیچے سے کھود کر نکالے اور پھر اسے جھاڑ پونچھ کر بازار میں لے آئے چنانچہ اب اردو میں جو کام سب سے زیادہ لگن اور تندہی سے ہو رہا ہے وہ ہے کھدائی کا کام یعنی اب ہمارے رسالوں میں جس طرح کے مضامین کی بھرمار ہے وہ خیراتی لال بے جگر، نول رائے وفا، میر کلو عرش، گھسیٹا بیگ عشق، عبدالقادر فی الحال وغیرہ جیسے شعرا کے حالات زندگی کی تحقیق اور ان کے کلام کی چھان بین سے متعلق ہیں۔ اس طرح کے مضامین کا متواتر مطالعہ کرتے کرتے مجھے کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے جیسے اردو ماضی کی زبان ہو اور اس کا سارا ادبی سرمایہ کسی [illegible] کا ملبہ ہو چکا ہو اور اس ملبے سے چن چن کر جو حضرات قیمتی اشیاء باہر لا رہے ہیں وہ یقیناً ایک کار خیر انجام دے رہے ہیں لیکن ان "نوادر" کو غور سے دیکھتا ہوں تو پھر یہ ردعمل بھی ہوتا ہے کہ جناب ایمرسن نے جو بات کہی تھی بالکل اس کے خلاف چلوں یعنی خیراتی لال بے جگر کا دیوان پڑھنے یا ان کے حالات زندگی سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اپنے محلے یا شہر کے کسی زندہ شاعر کا کلام سنوں یا پڑھوں اور اس کی تازگی اور خوشبو سے لذت حاصل کروں یا ان کی شخصیت سے دلچسپی لوں جو خود میرے سامنے ہنس بول رہے ہیں، چل پھر رہے ہیں اور ایسے اشعار کی تخلیق کر رہے ہیں جن سے لطف اندوز ہونا بھی اردو زبان سے اتنی ہی وفاداری کا ثبوت دینا ہے جتنا گھسیٹا بیگ عشق کے دیوان کا مخطوطہ پڑھ کر انبوہ محققاں میں اپنا نام لکھوانا۔

اس تذکرے کے بارے میں ایک اعتراف میں پہلے ہی کیوں نہ کر لوں کہ جن حضرات کا اس میں ذکر کیا گیا ہے ان کی مکمل سوانح عمری اور اندرون خانہ قسم کی تفصیلات سے میں نے عمداً احتراز کیا ہے۔ اول تو ان امور کے متعلق مستند معلومات فراہم کرنا بڑی جگر کاوی کا کام ہے، پھر ان کو سلیقے سے پیش کرنے کیلئے اسلوب بیان پر جو قابو حاصل ہونا چاہئے اس سلسلے میں اپنی نارسائی کا مجھے پورا احساس ہے۔ قلم گھستے پندرہ سال ہو گئے لیکن ان نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونا اب بھی آسان نظر نہیں آتا۔

اس تذکرے میں علی گڑھ کے موجودہ شعرا کے بارے میں لکھا گیا ہے اور موجودہ شعرا میں بھی صرف وہی حضرات اس دائرے میں آتے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طور پر یونیورسٹی سے ہے۔ تذکرہ باعتبار حروف تہجی ہے اور شعرا کے نام یہ ہیں۔

16 31-500

۱۔ اختر انصاری ۲۔ امین اشرف ۳۔ حسن مثنیٰ انور
۴۔ انور معظم ۵۔ جاوید کمال ۶۔ معین احسن جذبی ۷۔ حامد
الہ آبادی ۸۔ خالد ندیم ۹۔ خورشید الاسلام ۱۰۔ مسعود علی ذوقی
۱۱۔ راہی معصوم رضا ۱۲۔ آل احمد سرور ۱۳۔ شہاب جعفری
۱۴۔ شہریار ۱۵۔ قاضی عبدالستار ۱۶۔ مجنوں گورکھپوری
۱۷۔ مسعود حسین خاں ۱۸۔ نجیب الرحمٰن ۱۹۔ وارث کرمانی
۲۰۔ وامق جونپوری ۲۱۔ وحید اختر

جن شعراء کو اس تذکرے میں اپنا نام نظر نہ آئے ان سے مجھے یہ معذرت کرنی ہے کہ یا تو میں ان سے واقف نہیں ہوں یا ان پر کچھ لکھنے کی اپنے اندر اہلیت نہیں پاتا۔ آج کل ہمارے ملک میں مردم شماری کا زور ہے۔ میں بدقسمتی سے اس فن کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں ورنہ انسانوں کے کسی ہجوم میں ہر تیسرے شخص کے ماتھے پر لفظ "شاعر" پڑھ لینا بعض لوگوں کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ خیر یہ کام میں نہ کر سکوں گا تو اس کیلئے مجھ سے بہتر لوگ مل جائیں گے۔ خدائے بزرگ و برتر کی بنائی ہوئی دنیا باکمالوں سے ایسی خالی نہیں کہ ہم جیسے بے کمالوں کی وجہ سے اس کے کام بند رہیں۔

اس تذکرے کے جملہ حقوق بنام علی گڑھ اخبار محفوظ ہیں اور یہ اوراق بالاقساط اسی اخبار میں شائع ہوں گے۔

(باقی صفحہ کالم ۲ سے آگے)

رہتے تھے۔ مگر شاید بعد کو منٹو سرکل چلے گئے تھے۔ ان کی مذہبیت اور ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ان کو "مولانا" کہنا بھی بے جا نہیں ہو سکتا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آبائی جائداد کے انتظام میں مصروف تھے۔ اور میری آخری ملاقات غالباً سنہ ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی جب میں اتفاقاً ان کے وطن میں پہونچا تھا۔ اس کے بعد بھی بعض احباب سے ان کی خیریت معلوم ہوتی رہی۔ البتہ پاکستان میں آنے کے بعد سے میں ان کے حالات سے واقف نہیں ہوں دعا کرتا ہوں کہ زندہ اور تندرست ہوں ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ را

فنانس کمیٹی کی میٹنگ:۔ ۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو مسلم یونیورسٹی کی فنانس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں آنے والے مالیاتی سال کے تخمینہ پر غور کیا گیا۔

منتخب اشعار

اولڈ بوائز کی خاص ضیافت کے لئے ہم فارسی اور اردو کے عظیم شاعروں کے منتخب اشعار ہر اشاعت میں پیش کرتے رہیں گے۔ ابھی یہ تلاش ہی تھی کہ کس شاعر سے ابتدا کی جائے کہ اچانک خواجہ حافظ کا یہ مصرع ذہن میں چمک اٹھا ؎

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

چنانچہ انھیں کے نام سے ابتدا کر دی گئی امید ہے کہ حافظ کے اشعار کا سرمدی نشاط بیسویں صدی کی حشر انگیز فضا میں پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ باعث سکون ضرور ہوگا۔ (ادارہ)

حافظ شیرازی

فگند غلغلۂ عشق در عراق و حجاز
نوائے بانگ غزلہائے حافظ شیراز

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

خزو در کاسۂ زر آب طربناک انداز
پیش ازانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز

بیا جاناں منور کن ز روئت مجلس ما را
کہ در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

کہ برو بنزد شاہاں ز من گدا پیامے
کہ بکوئے مے فروشاں دو ہزار جم بجامے

سر خدا کہ عارف و سالک بہ کس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت
کیں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدۂ
فرصتت باد کہ دیوانہ نواز آمدۂ

ساعتے ناز مفرما و بگرداں عادت
چوں بپرسیدن ارباب نیاز آمدۂ

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

راہی معصوم رضا

دھوپ

آرزوئیں ہیں کہ سنولائی چلی جاتی ہیں
دور تک اب کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں
رقص کرتا ہوا بے چین بگولوں کا جلوس
کوئی اپنا بھی نہیں، کوئی پرایا بھی نہیں

چلچلاتی ہوئی اس دھوپ سے پوچھا نہ گیا
تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں کہاں رہتی ہے
ارض نکہت، ترے ہونٹوں کا گلستاں ہے کدھر
نہر شیرینیٔ رخسار کہاں بہتی ہے

دھوپ، بس دھوپ، کڑی دھوپ، ستمگر جلاد
انگنت ہاتھوں میں تانے ہوئے کرنوں کی سناں
منہ اگر کھولے تو چھد جائے [illegible] کی زباں
کوئی اس دھوپ سے گھبرا کے چلا جائے کہاں

دور تک اب کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں

•••

شہریار

انتظار

سر برہنہ ہواؤں کی تاکید پر
شام دامن سمیٹے تری راہ میں
خشک پتوں کو شبنم کی پوشاک سے
پھر سجائے ہوئے ہے تری چاہ میں

لڑکھڑاتے دریچوں کے آغوش سے
زرد پردے نکلنے کو بیتاب ہیں
چاند کی نرم کرنوں کی فریاد سے
کتنے پتھر پگھلنے کو بیتاب ہیں

کس شفق کے تبسم کی امید پر
تیری سانسوں کی تنہائی خاموش ہے
تیری باہوں کی انگڑائی خاموش ہے

•••

کنور مختار احمد خاں نے باہتمام منشو رام پرنٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں چھپوا کر دفتر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ سے شائع کیا۔